© rasailojaraid.com

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کراچی

سرسیّد احمد خان

افکار اور سیرت کا ایک بے لاگ جائزہ

سرسیّدؒ کی زندگی اور ان کے افکار و سیرت پر جب بھی نظر ڈالی جائے گی تو وہ دو بڑے ادوار میں بٹی ہوئی نظر آئے گی۔ پہلا دور ۱۸۵۷ء پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا دور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ سرسید کی تعلیم (اور وہ متوسط کتابوں سے آگے نہیں بڑھی تھی) اور تربیت پرانے انداز پر ہوئی تھی۔ اس میں قدیم نظام تعلیم و تربیت کی جہاں بہت سی خوبیاں تھیں، انحطاط پذیر معاشرے اور بگڑے ہوئے جاگیردارانہ ماحول کی خامیاں بھی تھیں۔ حصول تعلیم کی خاص عمر میں تعلیم سے بے توجہی اور عدم تکمیل، آوارگی ـــ میلوں ٹھیلوں میں شرکت کا شوق راگ رنگ کی مجلسوں کا چسکا۔ رنڈی بازی وغیرہ کی لت اسی انحطاط پذیر معاشرہ اور بگڑے ہوتے جاگیردارانہ ماحول کے اثرات تھے۔ لیکن مسلمانوں کے قدیم معاشرے کی جو خوبیاں اس وقت موجود تھیں اور بعد میں رفتہ رفتہ معدوم ہوتی چلی گئیں ان میں سے بعض سرسید میں موجود تھیں۔

سرسیّد کی زندگی کا پہلا دور روائتی انداز میں شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنے گھر سے، اپنے خاندان کے بزرگوں سے، اپنے استادوں سے، اپنے دوستوں سے، گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور ان کا ماحول جس قسم کی شخصیت کی تعمیر کرنا چاہتا تھا اسی طرح ان کی تعمیر ہوئی۔ ان کے افکار و معتقدات اور شوق و مشاغل سب وہی تھے جو ان کی طرح دوسرے نوجوانوں کے تھے۔ لیکن ان کا اظہار سرسید کی اپنی شخصیت کے حوالے سے ان کے مخصوص انداز میں ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی بالکل قلب ماہیت ہو گئی تھی۔ اس تبدیلی کی بنیاد ان کی سرکاری ملازمت کے آغاز سے پڑ چکی تھی۔ تکمیل ۱۸۵۷ء کے بعد ہوئی۔ اب وہ اپنے انداز فکر اور افکار و عقائد کے لحاظ سے بالکل مختلف شخصیت تھے۔ ایک قالب میں روح کے تسلسل نے انہیں ایک شخصیت کہنے پر مجبور کر دیا ہے ورنہ وہ اپنے پورے نظامِ فکر کے لحاظ سے ایک دوسری شخصیت کہلائے جانے کے مستحق تھے۔ اس تالیف کے آئینے میں یہ دونوں مختلف اور متضاد شخصیتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جدید تعلیم کی اشاعت، زبان و ادب کی ترقی، صفحات کے ذوق کی تعمیر، تحقیق و تدوین اور تالیف، و تر[illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تحریک میں سرسید کی خدمات کا انکار ممکن نہیں - بلکہ ہم ان کا شاندار الفاظ میں اعتراف کرنے پر مجبور ہیں - لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں دینی بے راہروی کی اگر علمی بنیادیں تلاش کریں تو وہ سرسید کی تفسیر، تہذیب الاخلاق کے مقالات، مذہبی مسائل و معتقدات کے بارے میں ان کے اسلوب اور افکار میں تلاش کرنی چاہئیں - سرسید نے بعض مذہبی معتقدات کے لئے صرف تاویل ہی کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ انکار و تمسخر کی روش کو اپنایا ہے - انہوں نے اسلامی معتقدات کی سربفلک عمارت کو ڈھایا ہی نہیں بلکہ اس کی تباہی پر قہقہے بھی لگائے اور اس کی شان و رفعت کا مذاق بھی اڑایا - میں یہاں ان کی تفسیر سے صرف ایک اقتباس پیش کروں گا - جنت کی حقیقت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے اس میں سنگ مرمر اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں - باغ میں شاداب و سرسبز درخت ہیں، دودھ و شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے - ساقی و ساقنیں نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں، ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے - ایک نے ران پر سر دھرا ہے، ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے - ایک نے لب جاں بخش کا بوسہ لیا ہے، کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ - ایسا بیہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے - اگر بہشت یہی ہو تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں "

اس عبارت کو ایک بار نہیں بار بار پڑھئے اور غور کیجئے، کیا یہ ایک اسلامی اور مبنی برنص قرآنی عقیدے کی حکیمانہ تفسیر اور محض تاویل ہے یا انکار و تمسخر - کیا اسے پڑھنے کے بعد سرسید کا کوئی معتقد اسلامی عقائد پر قائم و استوار رہ سکتا تھا اور رہا؟ حیرت ہوتی ہے کہ سرسید سا عقل پرست، اور وہ شخص جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے علم کلام کے ایک نئے مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی، فہم و بصیرت اور حکمت سے دور ایسی باتیں کرتا ہے - جنت کا خود ہی ایک نقشہ کھینچتا ہے پھر اس پر بیہودہ پن کی پھبتی کستا ہے اور پھر اپنے خرابات سے اس کا موازنہ کر کے انہیں جنت سے ہزار درجہ اچھا بتاتا ہے - یاللعجب!

یہ ہے اس دور کی بے دینی اور بدعقیدگی کا سرچشمہ جس کی تلاش میں ہمارے اہل علم اور اصحاب فکر زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں اور سررشتہ فکر پھر بھی ہاتھ نہیں آتا - یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ اس صدی کی بے دینی، مذہبی بے راہ روی اور بدعقیدگی کے تمام ڈانڈے سرسید سے ملتے ہیں - دور جانے کی ضرورت نہیں - پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور اسلامی شعائر کے احیاء میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ حضرات ہیں جو سرسید کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

سرسید کے دو دشمن تھے - ایک انگریز کے مخالف اور برصغیر کی آزادی کے خواہاں - دوسرے علماء دین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور تاریخ مسلمانان ہند کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ علمائے دین ہی انگریزوں کے سب سے بڑے مخالف تھے۔ سرسید نے دونوں حیثیتوں سے علمائے دین کو کبھی معاف نہیں کیا۔ تفسیر کے دینی مباحث ہیں ادب کے سنجیدہ مضامین ہیں تمثیلوں اور تجزیوں میں انہوں نے انگریز کے ان دشمنوں کو اپنی مخالفت، طنز و تعریض اور تضحیک و تمسخر کا نشانہ بنایا۔ انگریز سے دوستی اور اس کے مخالفوں کی دشمنی سرسید کا مذہب تھا۔ کوئی شخص انگریز سے دشمنی کر کے سرسید کا دوست نہیں بن سکتا تھا۔ گویا یہ دو تلواریں تھیں جو سرسید کے میان قلب میں جگہ نہ پا سکیں۔ اسی طرح مذہبی حیثیت میں انگریز کے ان دشمنوں کی مخالفت اور طنز و تعریض ان کا دین بن گیا تھا۔ دینی معتقدات پر ایمان رکھنے اور انہیں بیان کرنے والے ان کے نزدیک "کوڑ مغز ملا" اور "قل اعوذیے" تھے اور زہد و ورع کی زندگی اختیار کرنے والے کے لئے انہوں نے "شہوت پرست زاہد" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

ملا، صوفی، زاہد، قاضی، ناصح، اور واعظ کے متعلق شاعری میں طنز و تضحیک کے مضامین ملتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اردو یا فارسی کا سب سے پہلے شاعر کون اور کس عقیدے سے تعلق رکھتا تھا جس نے اسلامیات کی ان اصطلاحات اور دینی علم و سیرت رکھنے والی شخصیات کے خلاف یہ ادبی سازش کی اور اسلام سے تنفر کی تحریک کا آغاز کیا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو ادب میں اس تحریک کے آغاز کا سہرا سرسید ہی کے سر ہے۔ یہ محض قیاس یا سوءِ ظن نہیں بلکہ ایک عزیز کی تحقیق کے مطابق دینی فکر کے حامل افراد کے لئے "قل اعوذیوں" کی اصطلاح سب سے پہلے سرسید نے استعمال کی۔ انہوں نے اسلامی معتقدات کی ایسی تاویل کی کہ پورا نظام عقائد درہم برہم ہو گیا۔ ان کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا کہ پھر انہیں مانتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی۔ اور مخالفین اسلام کے حملوں کے دفاع کے لئے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں رہا۔ دینی علم و سیرت رکھنے والوں کے خلاف انہوں نے طنز و تعریض اور تضحیک و تمسخر کے اتنے تیر برسائے اور ان کے پاکیزہ چہروں کو ایسا مسخ کر کے پیش کیا کہ لوگوں کے قلوب ان کی عقیدت و محبت کے جذبات سے خالی ہو گئے۔

کسی عقیدے یا فکر سے وابستگی اور قلوب میں اس کے رسوخ کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ عقیدے اور فکر کا حسن کسی کو اپنی طرف متوجہ کرلے۔ اس طریقے سے ظاہر ہے کہ اہل علم ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس عقیدے اور فکر کے حاملین کی پاکیزہ سیرتیں اور نورانی چہرے دیکھ کر قبول حق کے لئے لوگوں کے قلوب کھل جائیں۔ سرسید نے ایک طرف تو علمائے دین کے تذکرے کے لئے جو اسلوب اختیار کیا اس نے اس ذریعے سے اسلام سے متاثر ہونے میں ایک رکاوٹ کھڑی کر دی۔ اور اسلامی معتقدات کے لئے جو طرز استدلال اختیار کیا اس سے قبول حق کے لئے قلب کھلنے کے بجائے اعراض و انکار کا دروازہ کھل گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اسلام اور اسلامی معتقدات سے برگشتہ ہوئے اور غیر مسلمان قبول اسلام کے عمل سے رک گئے۔ یوں بھی دیکھئے کہ زندگی بھر نہ تو کوئی شخص سرسید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی مذہبی صورت سے متاثر ہوا، نہ ان کی شرح و تفسیر انجیل پڑھ کر کسی عیسائی نے اپنے عقیدے سے توبہ کی۔ نہ ان کے مذہبی مقالات اور تفسیر قرآن پڑھ کر کوئی غیر مسلمان مسلمان ہوا۔ نہ مسلمان پکا مسلمان بنا۔ ان کے مکتب کی سب سے بڑی کرامت یہ رہی ہے کہ اس نے "قانونی مسلمان" (بقول مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی) اور ایثار و قربانی کی راہوں سے دور شور و ہنگامہ کرنے والے تعلیم یافتہ پیدا کئے۔ آج پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور قومی زبان کے نفاذ کی تحریک میں اہل علم اور نوکر شاہی کا جو طبقہ کسی نہ کسی سطح پر مخالفت کر رہا ہے وہ سرسید کا معتقد ہے۔ یا ان سے کسی نہ کسی قسم کا ذہنی و فکری رشتہ ضرور رکھتا ہے۔

ایک اہم مسئلہ سرسید کی تفسیر کی اشاعت کا ہے سرسید نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں۔ لیکن تفسیر تو سرسید نے خود شائع کی اور اردو میں شائع کی۔ سوال یہ ہے کہ اردو دان طبقہ کا تعلق عام لوگوں سے تھا یا خواص سے ہے؟ یہ کوئی نزاعی مسئلہ نہیں کہ اردو دان آج بھی "عام لوگ" سمجھے جاتے ہیں اور "خواص" وہ سمجھے جاتے ہیں جو صرف اردو دان نہ ہوں۔ بلکہ عربی، فارسی سے بھی واقف ہوں یا پھر انگریزی زبان و ادب یا دنیا کی کوئی اور بڑی اور علمی زبان اور اس کے ادب سے واقف ہوں۔ پس اگر تفسیر خواص کے لئے لکھی جاتی تو عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی وغیرہ زبانوں میں سے کسی زبان میں ہوتی۔ لیکن یہ روایت بھی تو حالی کی ہے کہ :- "ایک مولوی نہایت معقول اور ذی استعداد" سے سرسید نے سوال و جواب کے بعد کہا: میری تفسیر آپ کے لئے نہیں ہے، وہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو مذکورہ بالا عقائد (حشر و نشر، عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، فرشتہ و شیطان اور قیامت وغیرہ) پر پختہ یقین نہیں رکھتے یا ان پر معترض یا ان پہ متردد ہیں۔

اس مقام سے یوں ہی نہ گزر جائیے، غور فرمائیے کہ ان کی تفسیر خود ان کے بقول "نہایت معقول اور ذی استعداد" اشخاص کے لئے نہیں تھی اور ان ہی کے بیان کے مطابق "عام لوگوں میں بھی اس کا شائع ہونا اچھا نہیں تھا" عام لوگوں میں تو اس کی اشاعت کی عدم مناسبت اور عدم ضرورت کی مصلحت سمجھ میں آتی ہے۔ کہ ان میں اسلامی معتقدات کے بارے میں نہ اس وقت شک و شبہ پایا جاتا تھا نہ آج۔ نہ وہ ان پر کبھی معترض ہوئے، نہ انہیں ان کے ماننے میں کبھی تردد ہوا۔ ان کے ذہن منطق و فلسفہ کی باریکیوں کو قبول ہی نہیں کرتے۔

اب سرسید کی تفسیر کے مطالعہ کے دوسرے حاجت مندوں کی ضرورت پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ انگریزی زبان کا علم اس وقت تک عام نہ ہوا تھا، اس کا زہر کہاں پھیلتا اور اس تریاق کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ جدید فلسفہ اور ان کی موشگافیوں اور قدیم حکماء، معتزلہ کی تاویلیت سے عوام تو عوام، خواص بھی ناواقف تھے جہاں جدید و قدیم علوم کی تعلیم ایک دو فی صد سے زیادہ نہ ہو۔ اس میں سے فلسفہ و حکمت کا ذوق رکھنے والے کتنے نکلیں گے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الحاد و تشکیک کا جو سیلاب بیسویں صدی کے آغاز میں آیا، اس وقت اس کا پتہ نہ تھا، اس لیے انگریز
دانوں، فلسفہ گزیدوں، معتزلہ کی تاویلات کے نخچیروں اور الحاد و تشکیک کے ماروں کے لئے بھی ان کی تفسیر کی
اشاعت نہیں ہو سکتی تھی جن کا وجود ہی محض ایک مفروضہ اور عنقا کی مثال تھی۔ بالفرض کوئی ایسا طبقہ موجود
تھا جو کسی نئے علم کلام کا محتاج تھا تو پھر دیکھنا چاہیے کہ سرسید نے مذکورہ بالا عقائد کے اثبات میں کون سے
پیش کیے ہیں؟ انہوں نے خود حشر و نشر، عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، فرشتہ و شیطان وغیرہ کے بیان
جو مضحک، تمسخرانہ اور طنزیہ اسلوب اختیار کیا ہے اس کا رشتہ اثبات کے بجائے اعراض و انکار سے جا ملتا
سرسید کے افکار کے مطالعے کے بعد اسلامی عقائد کی صحت میں شک اور یقین میں تذبذب تو پیدا ہو سکتا ہے
ان پر غیر متزلزل ایمان اور اعتقاد میں پختگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ جو تفسیر چھپی اس پر یہ کہاں لکھا
گیا تھا کہ مسلمانوں کے فلاں طبقے کے لئے اس کا مطالعہ ممنوع ہے اور اگر لکھ بھی دیا جاتا تو یہ بات مطالعے
لیے محرک تو بن سکتی تھی۔ رکاوٹ ہرگز ثابت نہ ہوتی۔ تفسیر اردو میں چھپی تھی۔ سرسید کے ذہن میں اس کا مخاطب
ہو۔ مطالعے میں سب سے زیادہ "عام لوگوں" کے آئی۔ لیکن کیا سرسید کے فکر کی پوری صداقت اور رائے کا
اخلاص تفسیر کی عدم اشاعت و ضرورت مطالعہ کے متعلق ان کے مذکورہ ملفوظات میں موجود ہے؟ اس بات
بھی غور فرما لیجیے کہ آیا سرسید واقعی عام لوگوں میں اپنی تفسیر کی اشاعت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے یا معقول و ذی
استعداد لوگوں میں اس کی ضرورت کے قائل نہ تھے؟

سرسید کا ایک بیان وہ ہے جو آپ زیر تالیف کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے اور ایک مطالعہ تفسیر
عام لوگوں" دعوت" یہ ہے جس کے لئے تحریک پیدا کرنے کا مشورہ انہوں نے اپنے ایک عقیدت مند طالب علم
یہ عقیدت مند فرسٹ ایر کا طالب علم نیاز علی تھا جو اپنے تئیں روایتاً مسلمان نہ کہتا تھا بلکہ اپنے علم و مطالعہ
بنیاد پر اسلام کو سچا اور برحق دین سمجھ کر پختہ یقین رکھتا تھا۔ سرسید نے اس کے نام خط میں یہ مشورہ دیا کہ
تفسیر خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنے ہم ذوق لوگوں کو جمع کر کے انگریزوں کی طرح ایک کلب قائم کر
اور چندہ جمع کر کے تفسیر منگوا لے اور تمام ممبران باری باری اس کا مطالعہ کر لیں۔ اورینٹل کالج میگزین لا
ش ۴ ۲۲ص ۲۲۔ اب سرسید ہی کی اس تحریر کے ہوتے ہوئے اس بات پر کیسے یقین کر لیا جائے کہ وہ عام مسلما
میں تفسیر کی اشاعت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور معقول اور ذی استعداد لوگوں کے لئے اس کے مطالعے
ضرورت کے قائل نہ تھے۔

سرسید کے عقائد صحیح تھے یا غلط؟ دیوبند، بریلی، اہل حدیث وغیرہ کسی مسلک کے عالم دین کی با
مانیے۔ اگرچہ دین کے معاملے میں بات انہی کی ماننی چاہیے۔ ان کے سب سے بڑے مخالف امداد العلی اور علی بخش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی بات بھی نہ مانئے، ان کے معتقدین و مخلصین کے افکار پر نظر ڈال لیجئے، جنہیں نہ آج تک کسی نے قل اعوذی ہے، نہ ان کے فکر و عمل پر ملائیت کی کبھی پھبتی کسی گئی۔ میرا اشارہ محسن الملک، حالی اور ڈپٹی نذیر احمد طرف ہے۔ محسن الملک کو سرسید سے باہم اخلاص و عقیدت بہت سے وسائل میں اختلاف کرنا پڑا اور انہیں مسلمانوں میں "چھپا پادری" قرار دیا۔ حالی کو بھی سرسید سے تعلق و ارادت کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑا سرسید نے تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اور بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں اور نذیر احمد نے تو ان کی متعدد خدمات کے اعتراف کے باوجود یہاں تک لکھ دیا کہ"

"جو معان سید احمد خان نے منطوق آیاتِ قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کئے اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے، قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کا ماننا مشکل۔ یہ معنی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبریل حاملِ وحی کا، نہ رسولِ خدا کا، نہ قرآن کے کاتب و مدون نہ اصحاب کا، نہ تابعین کا، نہ تبع تابعین کا، نہ جمہور مسلمین کا"

سرسید کی تفسیر کے بارے میں ان کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ

"سرسید کی تفسیر دیوانِ حافظ کی ان شرح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے جو توڑ دل سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتاب تصوف بنا دیا ہے"

کہتے ہیں درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور عمل کی کسوٹی اس کے نتائج ہیں۔ سرسید نے ایک درخت لگایا تھا تو اس میں پھل بھی ویسا ہی آیا جیسا کہ سنت الٰہی نے اس کے لئے مقدر کر دیا تھا، اور عمل کا انہوں نے بیج بویا تھا ہمیں ضروری تھا کہ اس سے برگ و بار بھی وہی پیدا ہوں جن کی صلاحیت قدرت الٰہی نے اس کی فطرت میں ودیعت کی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آج ان حقائق اسلامی کے یقین سے محروم، ان کی صداقت میں تشکیک و تذبذب کا شکار، قرآن کے بیان کردہ معنوں کی صحت میں متردد حتیٰ کہ معترض وہی لوگ ہیں جو سرسید کے افکار و سیرت سے متاثر ہیں اور جن لوگوں کے مفروضہ الحاد و تشکیک کے رفع کے لئے تفسیر لکھی گئی تھی وہی ان کی تفسیر کو پڑھ کر قرآنی صداقتوں کے اعتقاد سے سب سے زیادہ محروم ہو گئے ہیں۔ حکیم وقت نے تو الحاد و تشکیک اور تذبذب و تفسق کے موجودہ طوفان کا منبع کانٹ، ہیگل اور مارکس کے فلسفوں کے بجائے سرسید کے افکار کی اشاعت کو قرار دیا ہے۔

سرسید کی خدمات کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیمی میدان میں تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن سرسید نے تعلیم کا جو مقصد مقرر کیا تھا، وہ پورا ہوا؟ اور اس مقصد کے تحت علی گڑھ کی سرزمین میں جو پودا لگایا تھا اس کے پھل کے ذائقے سے وہ محظوظ و لطف اندوز ہوئے تھے؟ اس سوال کے جواب کی ذمہ داری سرسید نے دوسروں کے لئے نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چھوڑی۔ یہ بات ان کے اپنے بیان اور تحریر سے باہر نہیں۔ کہ وہ اس کے نتائج سے مایوس اور اس کے پھل کی تلخی سے بدمزہ ہو گئے تھے۔ کہاں سرسید کا یہ مقصد کہ ایک ہاتھ میں سائنس اور دوسرے ہاتھ میں قرآن ہوگا۔ اور کہاں ان کی تعلیم و تربیت کے نتیجے میں اسلامی عقائد پر عدم یقین، تہذیب اور تشکیک کا سیلاب عظیم؟ شاید بعض حضرات مدرسہ علی گڑھ کی طویل تاریخ میں چند مثالیں دینداری کی پیش کر کے اس کے پھل کی تلخی اور نتائج سے مایوسی کی بدمزگی کو دور کرنا چاہیں۔ اول تو کوئی ہوشمند، صاحب مطالعہ اور دیندار ایسا کرے گا نہیں، بالفرض اگر کوئی ایسا کرتا بھی ہے تو مستثنیات سے ہم کب انکار کرتے ہیں۔ سعید و صالح فطرت اور قلب سلیم گرد و پیش کے اثرات سے بہت کم متاثر ہوتے ہیں۔ اور اگر انہیں اس ماحول میں کوئی روشن سیرت بھی نظر آ جائے تو ماحول کے اثرات سے یقیناً محفوظ ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ علی گڑھ کے شعبہ اسلامیات میں شروع ہی سے کوئی نہ کوئی عالم حق اور صاحب سیرت رہا ہے۔ اور مدرسہ سرسید کے کچھ نہ کچھ طلبہ اپنے خاندانی پس منظر، ابتدائی تعلیم و تربیت، اپنی ازلی سعادت اور قبول حق کی استعداد کی بنا پر ان علمائے حق اور اصحاب سیرت سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے دینداری، نیکی اور شرافت کی کوئی مثال مل جاتی ہے تو یہ سرسید کے مکتب کی کرامت نہ تھی بلکہ اس کا سبب ان اساتذہ کی تعلیم و تربیت اور صحبت میں تلاش کرنا چاہیئے جن کا جوہر علم مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر تھا اور جن کی سیرتیں سیرت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے انوار سے منور تھیں۔

میں نے یہاں تعلیم کے نتائج سے صرف سرسید کی مایوسی کا ذکر کیا ہے۔ حالی کے اعتراف، شبلی کے استدلال، سلیمان ندوی کی تحقیق کو پیش نہیں کیا۔ ابوالکلام چونکہ خود اپنا ایک نظام فکر رکھتے تھے۔ اس لئے ان کا حوالہ تو کسی طرح دے ہی نہیں سکتا۔ لیکن ہمیں ان کی تعلیم و تربیت کے نتائج سے مایوس اور ان کا شکوہ سنج نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ تعزیر یا میں سائنس اور قرآن کی تختہ بندی کے عزم کا انہوں نے صرف ذکر کیا تھا۔ کالج کے قیام کا "اصلی مقصد"، یہ نہیں تھا کہ نتائج کی جانچ کے لئے اسے کسوٹی بنایا جائے۔ کالج کے قیام سے سرسید کا مقصد لارڈ میکالے کے مقاصد تعلیم کی تکمیل تھا میکالے نے کہا تھا کہ تعلیم کا مقصد ذہن و فکر کے لحاظ سے انگریز تیار کرنا ہونا چاہیئے خواہ مذہب کی رو سے وہ ہندو یا مسلمان کہلائیں۔ سرسید فرماتے ہیں:-

"اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالخصوص اعلیٰ درجے کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ تیار کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرسید اردو کے بڑے حامی اور بڑے ادیب تھے۔ زبان و ادب پر ان کے بہت احسانات ہیں۔ اردو کے عناصر خمسہ میں سرسید کا مقام سب سے اونچا ہے اردو زبان و ادب کی کوئی تاریخ ان کے احسانات و تذکرے اور ان کی بڑائی کے اعتراف سے خالی نہیں۔ آئندہ بھی جو تاریخیں لکھی جائیں گی ان میں سرسید اور ان کے رفقاء کے لئے شاندار باب ہوگا۔ اور ان کی خدمات اور ان کی ادبی عظمتوں کو خراج تحسین پیش کیا جائے گا۔ اس کے بغیر کوئی ادبی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

سرسید کی زندگی کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ انہوں نے ہندی کے مقابلے میں اردو کے تحفظ کی تحریک میں انتہائی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ لیکن وہ سرسید ہی تھے جنہوں نے اردو میں سائنسی تراجم کی تحریک کو خود ختم کر دیا تھا۔ اور اورینٹل کالج لاہور کے قیام کی شدید مخالفت کی تھی۔ تحقیق طلب امر یہ ہے کہ سرسید نے اردو ہندی تنازع میں جن شدید جذبات کا مظاہرہ کیا تھا اور جو پرجوش مضامین تحریر کئے تھے کیا واقعی اردو کے عشق میں تھے؟ کیا وہ واقعی ان کے حقیقی و مخلصانہ جذبات تھے؟ کہیں یہ بھی انہوں نے کسی انگریز کے ایما پر تو نہیں لکھے تھے یا فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے لئے کئی دوسرے مضامین کی طرح یہ بھی کسی "مسٹر بیک" نے تو ان کے نام سے لکھ کر نہیں چھپوا دئے تھے؟

زمانہ سازی اور وقت شناسی سرسید کو ان کے نانا سے وراثت سے ملی تھی۔ ان کے نانا نے سلطنت مغلیہ کی بہی خواہ کے پردے میں انگریزوں کی خدمات سرانجام دی تھیں۔ سرسید نے اپنے عہد میں ٹھیک ٹھیک وہی کردار مسلمانوں کی بہی خواہ کے نام پر ادا کیا۔ مغلیہ حکومت اپنے جس انجام کو پہنچی اس کے اسباب فلسفہ عمرانیات کے علماء کے نزدیک اندرونی تھے۔ علمائے سیاسیات اور مورخین نے اس کے خارجی اسباب میں انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کو بتایا ہے۔ لیکن آج تک کسی مسلمان کو تو کیا کسی غیر مسلمان کو بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہ ہوئی کہ قومی اور مغلیہ حکومت کو ختم کرنے اور انگریزوں کے اقتدار کو قائم کرنے اور مستحکم کرنے میں وہ انگریزوں کا برابر کا حصہ دار ہے۔ سرسید اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ اور کہا کہ وہ ہمیں ہیں جنہوں نے انگلش حکومت اپنی بھلائی کے واسطے قائم کی۔" انہوں نے قوم کی جانب سے بھی صفائی پیش کر دی کہ یہ محض غلط ہے۔ کہ مسلمان انگلش حکومت کو ایک ناگواری سے دیکھتے ہیں۔" انہوں نے اس بات کی بھی تردید کر دی کہ انگلش مینشن نے دھوکے یا فریب سے یہ ملک فتح کیا۔" وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انگریزوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی ہے نہ کہ مکر و فریب سے۔ وہ اس ملک میں دوست کی حیثیت سے آئے ہیں نہ کہ بطور ایک دشمن کے۔" پھر انہوں نے اپنی اس نیک خواہش کا اظہار بھی کیا۔

"ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل (دائمی و ابدی) ہونی چاہئے۔ ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لئے نہیں بلکہ اپنے ملک کے لئے ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مقام کا نام آغاز پور رکھا گیا۔[۲۲]

اس کے بعد بایزید کی یہ تحریک مذہب کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی تحریک بھی بن گئی۔ جس نے صوبہ سرحد کے عوام کے جذبۂ حریت کو جہاد میں بدل دیا۔ جس کے بعد خوشحال خان خٹک جیسے ملی شاعر اور جذبۂ آزادی کے علمبردار پیدا ہوئے۔ جو تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں اور بایزید کی سیاسی تحریک ہی کا اثر تھا کہ عہد برطانیہ میں عجب خان کی بہادری نے انگریزوں کی نیندیں حرام کر دیں[۲۳] اور اس علاقے کے لوگوں کے جذبہ حس ایمانی اور حریت ہی کی بنا پر "سکھ راج میں سید احمد شہید نے ہندوستان سے ہزاروں میل دور اس سرزمین کو اپنا مرکز بنایا اور وادی کاغان کے شہر بالاکوٹ میں اسلامی تحریک احیار کے جدیدہ کا یہ تاجدار ہمیشہ کے لئے مدفون ہے"[۲۴] اور اسی تحریک کے سیاسی اثر کی بنا پر اس خطہ کے لوگوں نے قیام پاکستان میں اپنا بھرپور کردار ادا کر کے قائد اعظم سے ان الفاظ میں خراج تحسین وصول کیا۔

" آپ کی وفاداری، اعانت اور بہادری کی وجہ سے ہم شمال مغربی سرحدوں کی دفاع سے بے فکر ہیں۔ قیام پاکستان میں آپ کا کردار ہمیشہ کے لئے سنہری حروف سے لکھا جا چکا ہے مجھے آپ کی اسلام دوستی اور ملی اتحاد پر فخر ہے"[۲۵]

ان تمام حقائق کے بعد یہ فیصلہ کرنا کوئی مشکل امر نہیں کہ دسویں صدی ہجری کی ان دونوں شخصیتوں (بایزید انصاری اور پیر بابا) نے اپنے اپنے انداز میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی اصلاح کی۔ پیر بابا نے انہیں خالص روحانی تعلیمات سے آشنا کیا اور بایزید کی تحریک روشنیہ نے ان کے لئے روحانی اصلاح کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معاشرے کے قیام کی تگ و دو کی جو ان کے لئے اسلامی تعلیمات پر عمل درآمد کرنے کی فضا مہیا کر سکے۔ اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب کہ انہیں سیاسی آزادی حاصل ہوتی اور سیاسی آزادی کے حصول کا یہی وہ جذبہ تھا جو دسویں صدی ہجری میں تحریک روشنیہ نے اس خطے کے لوگوں میں پیدا کیا جو آگے چل کر پاکستان کے حصول کا سبب بنا۔ اور اس طرح تحریک روشنیہ کی وہ کوششیں جو آج سے تقریباً پانچ سو سال قبل شروع کی گئی تھیں پاکستان کی صورت میں کامیاب ہوئیں۔ جس کے تحریک روشنیہ کے بانی بایزید انصاری کو جتنا بھی خراج عقیدت پیش کیا جائے کم ہے۔

ماخذ

۱۔ عبداللہ سید (مدیر) اورینٹل کالج میگزین۔ لاہور پنجاب یونیورسٹی پریس فروری ۵۵ء ص ۵ (۲) ایضاً

۳۔ پیر بابا جن کا نام سید علی ترمذی تھا ۹۰۸ ہجری میں افغانستان میں پیدا ہوئے۔ حصول علم اور معرفت کی

© rasailojaraid.com